

یہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم ہے

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

یہ تقریر پاکستان کی عظیم دینی درس گاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن (نیوٹاؤن) کراچی میں ۱۳ جولائی ۱۹۷۸ء کو طلبہ کے سامنے کی گئی جس میں جامعہ کے اساتذہ، طلبہ، اراکین انتظامیہ کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں کے علماء اور تعلیم یافتہ حضرات نیز بیرون ملک کے ان مندوبین کی بھی معتد بہ تعداد شریک تھی جو اسلامی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔

عزیز طلبہ اور حاضرین مجلس!

اس دین کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر اور مقدر کر دیا ہے کہ اس کے لیے زندہ اشخاص برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ کوئی درخت اس وقت تک سرسبز و شاداب اور زندہ درخت نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ باثمر نہ ہو۔ اس میں نئی نئی پتیاں اور نئے نئے شگوفے نہ کھلتے رہتے ہوں۔ یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کے لیے ہے اور اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، وہ دین مٹ گئے، ختم ہو گئے جنہوں نے روحانیت کے میدان میں، علم کے میدان میں، فکر کے میدان میں، قیادت کے میدان میں زندہ اشخاص پیدا کرنے بند کر دیئے، انسان زندہ اشخاص سے متاثر ہوتا ہے، چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور چراغ سے چراغ جلنا چاہیے اور جلتے رہنا چاہیے اور اگر اس امت کو باقی رہنا ہے تو اس امت کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندہ اشخاص پیدا کرے۔ اس کا درخت علم، اس کا درخت فکر، اس کا درخت اصلاح اور اس کا درخت روحانیت نئے نئے برگ و بار لاتا رہے، نئے نئے شگوفے کھلاتا رہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ میری امت بارانِ رحمت کی طرح ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ اس کے ابتدائی قطرے مردہ زمین کے لیے زیادہ حیات بخش ہیں یا بعد کے۔

میں تاریخ لکھتا رہا ہوں، میرے شعور اور تصنیف و تالیف کی عمر زیادہ تر اسی کوچہ میں گزری اور میں کہہ سکتا ہوں:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

میں اب بھی اس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ اسلاف کے کارنامے، اسلاف کا خلوص و صداقت، اسلاف کا تعلق مع اللہ اسلاف کی استقامت اور اسلاف کی قربانیاں بعد کی نسلوں کے لیے بہترین سرمایہ ہیں اور وہ حیات زندگی کا پیغام دینے والی ہیں، ہم نے ہمیشہ کہا اور مانا کہ ہمارے بزرگ ایسے تھے، ان کا حافظہ اتنا قوی تھا، ان کا علم اتنا وسیع تھا، وہ ایسے بحرِ عالم تھے، یہ سب سر آنکھوں پر لیکن اتنا کافی نہیں۔

جس ادارہ اور کتب خیال سے میرا تعلق ہے اس نے تاریخ اسلام کو مرتب کیا، اس تختی براعظم (ہند) میں جس ادارہ نے اردو میں تاریخ اسلام مرتب کرنے کی سب سے پہلے سعادت حاصل کی ہے اس سے میرا تعلق ہے، یعنی ”دارالعلوم ندوۃ العلماء“ اور ”دارالمصنفین“ کسی اور کی زبان سے تو شاید آپ سوچیں کہ یہ تاریخ سے ناواقف ہے اور تاریخ سے انصاف نہیں کرتا، میری زبان سے سنئے کہ اسلاف نے جو کچھ کیا اس کو محفوظ رہنا چاہیے اور اسی آب و تاب کے ساتھ رہنا چاہیے اور نئی نسلوں کو اس سے روشناس کرانا چاہیے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسلاف کے کارنامے جمع کرنے چاہئیں۔ لیکن اس دین کے لیے خدا فیصلہ کر چکا ہے کہ یہ دین قیامت تک کے لیے ہے لہذا اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، روحانیت بھی زندہ انسانوں ہی سے قائم ہے، محققین صوفیاء کی اور مشائخ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ تزکیہ و علم باطن بھی زندہ انسانوں ہی سے حاصل کیا جاتا ہے اور زندہ انسانوں ہی سے اس کی تکمیل ہوتی ہے، ورنہ ایسے ایسے بلند مرتبہ لوگ گزرے ہیں کہ ان میں سے ایک کافی تھا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ زندگی میں حرکت و نمو ہے، زندگی میں تنوع ہے، ابھی ایک رنگ آیا ایک رنگ گیا، ابھی ایک مرض پیدا ہوا اور ایک مرض گیا، اس لیے جن کا تعلق اس زندہ کائنات اور عالم طبعی سے ٹوٹ چکا ہے وہ ان متحرک اور زندہ انسانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتے، فیض ان سے حاصل ہو سکتا ہے (فیض کے جو طریقے ہیں ان کے ذریعہ) اس میں غلط فہمی نہ ہو لیکن رہنمائی زندہ انسانوں ہی سے حاصل ہوتی ہے، کسی نسل میں سب کچھ ہے، بڑے کتب خانے ہیں، تاریخ کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں لیکن زندہ ہستیاں نہیں ہیں جن کے قلوب سے اور جن کے اجتہاد و فکر سے، جن کے تفقہ سے، جن کی بصیرت سے ہم روشنی حاصل کریں، اس نسل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

حدیث صحیح میں ہے کہ: ”ان اللہ یبعث علی رأس کل مائة سنة من یجدد لهذه الامة امر دینہا“ سنن کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر سو برس میں ایک مجدد بھیجتا رہے گا جو اس دین کو تازہ کرے گا اور تجدید کا فرض انجام دے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت تو وہ دین کو تازہ کر دے گا، پھر وہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ

ہے کہ عرصہ تک اس کا وجود رہے گا، من یجدد لهذه الامة امر دینہا کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آئے اور ہفتہ دو ہفتہ کے لیے دین کا چرچا ہوگا اور چلے گئے۔ ان میں سے کسی بھی بزرگ کا حال پڑھیں، کسی کا اثر سو برس تک رہا اور بعض ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کا اثر صدیوں تک رہا۔

ریلوے لائن پر ایک چھوٹی گاڑی چلا کرتی تھی۔ (اور غالباً اب بھی چلتی ہے) جس کو ٹرائی کہتے تھے، لوگ اس کو ٹھیلے تھے اور پھر اس پر بیٹھ جاتے تھے اور وہ چلتی اور پھسلتی رہتی تھی، جب وہ رکنے لگتی تھی تو پھر اتر کر دھکا دیتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے، اس سے لائن کا معائنہ ہوتا تھا، اس امت کی گاڑی کو بھی اسی طرح سمجھیے اور اس کو ٹھیلنے والے اس امت کے علماء اور مشائخ اور مجدد ہیں، یہ اس کو ٹھیل دیتے ہیں اور وہ خود اپنے پیہوں پر چلتی ہے، یہ نہیں کہ اس کو چلاتے ہی رہتے ہیں، گاڑی خود چلے گی اپنے پیہوں پر، لیکن اس کو ٹھیلنے اور چلانے کے لیے زندہ انسانوں کی ضرورت ہے۔ وہ کوئی ٹیکنیکل چیز نہیں، زندہ انسان اس کو بڑھاتے ہیں اور ٹھیلے ہیں اور وہ اپنے پیہوں پر چلتی ہے کیونکہ ٹرائی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے، پٹریوں میں اتنی چکنا چٹ اور پیہوں میں اتنی حرکت و سرعت اور چلنے کی اتنی صلاحیت ہو کہ وہ چل سکے اور آدمیوں کے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اس کو ٹھیل سکیں اور مسافر جو بیٹھے ہوں وہ ایسے ہوں کہ بیٹھے رہیں اور جم جائیں، اس امت کی روایت یہ ہے کہ جب اس پر تعطل اور بے عملی طاری ہونے لگتی ہے تو کوئی اللہ کا بندہ آتا ہے اور اس کو دھکا لگاتا ہے اور پھر وہ خود چلتی ہے اور کچھ دور تک چلی جاتی ہے۔

میں مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحب دونوں کو اس دور کا مجدد سمجھتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ جہاں کہیں بھی علم دین ہے، جہاں کہیں بھی سنت کی دعوت ہے، جہاں کہیں بھی شرک و بدعت سے اجتناب کا جذبہ اور اس سے تنفر ہے، یہ ان دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے، دیکھیے ایک ایسا بھی انسان تھا جس نے اس زور سے دھکا دیا کہ امت کی گاڑی ساڑے تین سو سال سے برابر چل رہی ہے اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کتنا چلے پھر کوئی اور اللہ کا بندہ پیدا ہو اور اس کے دھکے سے اور کتنا چلے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا پورا خاندان، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سوڈیڑھ سو برس بعد پیدا ہوا اور ان کے کام کے اثرات تیرہویں صدی کے ابتداء میں ظاہر ہوئے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فریضہ ہے تمام مدارس کا اور تمام علماء کا، کہ زندہ اشخاص پیدا کرتے رہیں۔

میرے عزیزو! کل میں نے دارالعلوم کو رگی میں ایک بات کہی تھی کہ پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے علماء ملک میں رہیں کہ وہ نئے مسائل سمجھ سکیں اور نئے مسائل کے حل پیش کر سکیں اور اس میں وہ شریعت کی مدد سے کتاب و سنت کی مدد سے، اصولی فقہ اور فقہ کی مدد سے رہنمائی کر سکیں، اس لیے جہاں اور چیزوں کی ضرورت

ہے وہاں ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے تبحر علماء پیدا ہوں جیسے مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ۔

اور دوسرے علماء جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آئے، پھر اس کے بعد میں نے کہا کہ زمانہ اتنا ترقی کر گیا ہے اور اب زمانہ کے فتنے اتنے سنگین اور زمانے کے چیلنج اتنے شدید ہیں کہ حقیقتاً ضرورت تھی امام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ اس وقت نہ پیدا ہوں تو کم از کم اس درجہ کے لوگ پیدا ہوں جن کے نام میں نے لیے۔ لہذا مدارس کا یہ فرض ہے کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگادیں کہ وہ تبحر پیدا ہو، وہ وسعت نظر اور عمق اور نظر کی گہرائی اور گیرائی پیدا ہو اور وہ کتاب و سنت کی روح سے واقفیت پیدا ہو، مقاصد شریعت سے آگاہی پیدا ہو، بدلے ہوئے زمانہ میں امت کی رہنمائی کر سکیں، محض یہ کہ کتاب میں دیکھ لو، یہ کافی نہیں، اس لیے کہ کتابیں تو اپنے اپنے عہد میں لکھی گئی ہیں، اللہ نے صرف کتاب اللہ کی یہ خصوصیت قرار دی ہے کہ لا تبلی جدتہ ولا تنتہی عجائبہ کہ وہ کبھی پرانی نہیں ہوگی، باقی ہر انسانی کتاب میں اس عہد کی چھاپ ہوتی ہے اس عہد کے گھنے سائے ہوتے ہیں، آپ کسی عالم کی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے، اگر اللہ نے آپ کو ذوق اور علمی بصیرت دی ہے تو آپ اسے دیکھ کر زمانہ کا تعین کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب فتنہ تاتار کے بعد لکھی گئی ہوگی، یہ آٹھویں صدی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، ہر صدی کا اسلوب الگ ہوتا ہے، فکر اور علم کا طرز الگ ہوتا ہے، ان کے درجات الگ ہوتے ہیں، یہ مدارس بہت مبارک اور نہایت ضروری ہیں، ہم سب مدارس ہی کے خوانِ نعمت کے ریزہ چیں ہیں اور میں جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا بات کہہ رہا ہوں، یہ مدارس ہی کا فیض ہے، اول سے آخر تک میری تعلیم اسی نہج پر ہوئی، لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں (اور خدا کرے کہ میری بات جتنی ہے اور جس درجہ کی ہے اسی کے مطابق سمجھا جائے) کہ یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کی اس کو ضرورت ہے اور زندہ انسانوں ہی کے دم سے یہ چلے گا، اسلاف کی عظمت میں رتی برابر کمی کرنا مقصود نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ اس پر قناعت نہیں کرنی ہے کہ اسلاف نے یہ کیا، کوئی مسئلہ پوچھنے آئے تو کہے کہ ہمارے یہاں ایک سے ایک بڑا عالم پیدا ہوا، آسمانِ علم، جبلِ علم، سائل کہتا ہے کہ کنویں میں فلاں جانور گر گیا ہے، تمام محلہ والے پریشان ہیں کتنے ڈول پانی نکالا جائے، آپ کہیں کہ ہمارے یہاں امام ابوحنیفہؒ پیدا ہوئے، امام زفرؒ پیدا ہوئے اور آخر میں بدائع الصنائع کے مصنف، البحر الرائق کے مصنف اور فتاویٰ عالمگیری کے مصنف پیدا ہوئے، وہ کہے گا حضرت یہ سب صحیح ہے، لیکن جلدی بتائیے نماز کا وقت بالکل قریب ہے کہ اس کو کس طرح پاک کیا جائے؟ کوئی آپ سے یہ پوچھنے آئے کہ ذرا سی یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی، یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا، اس کے معنی بتائیے، آپ

کہیں کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کا جواب نہیں، عبدالقادر جرجانی پیدا ہوئے، ابوعلی فارسی پیدا ہوئے، امام زکریا پیدا ہوئے، حریری پیدا ہوئے اور قاضی فاضل پیدا ہوئے اور ہندوستان میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہوئے ہیں، وہ کہے گا یہ سب ٹھیک ہے لیکن میں کتاب پڑھانے جا رہا ہوں، طالب علم منتظر ہیں جلدی سے شعر کا مطلب بتائیے، اسی طرح ہر فن کا حال ہے، جس فن کا آدمی آیا تو کہہ دیا کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔

ہر ملک میں بلکہ ہر شہر میں ایسے تبحر آدمی ہونے چاہئیں جو وقت پر مدد کر سکیں، رہنمائی کر سکیں، یہ نہ کر سکیں تو کم از کم کسی عالم کا حوالہ دے سکیں، میں خود یہ کرتا رہتا ہوں، کوئی اہم مسئلہ پوچھنے آتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ہمارے مدرسہ میں مفتی موجود ہیں ان سے پوچھو ”لکل فن رجال“ ہر فن کا شخص الگ الگ ہے، وہ فقہ پڑھاتے ہیں، علامہ ابن حزم کے متعلق امام ابن تیمیہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے سعی میں رمل واضطباع کو لکھ دیا ہے، وہ بہت ادب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کو حج کرنے کا موقع نہیں ملا تو ان کو طواف اور سعی میں التباس ہو گیا۔ یہ بات الگ ہے، لیکن ہر چیز میں آپ اسلاف کے کارناموں کی فہرست گنا نے لگیں کہ کیسے کیسے آدمی پیدا ہوئے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص پیاسا ہو اور پانی پینے آئے اور کہے کہ پانی پلا دیجیے تو آپ اس سے کہیں کہ دنیا میں ایسی ایسی سبیلں لگی ہیں اور ایسی ایسی آکس کریمیں ایجاد ہوئی ہیں، ایسے ایسے مشروبات ایجاد ہوئے ہیں، تو بھائی مشروبات کے نام لینے سے اور اس میں جو ترکیاں آپ کے اسلاف نے کیں اس سے کیا ہوتا ہے، اس کو تو پانی چاہیے، آپ کٹورہ میں دیں یا مٹی کے کوزہ میں دیں، جب جا کر اس کی پیاس بھیجے گی۔

علوم کا زوال بلکہ امتوں کا زوال اسی طرح ہوا کہ جب کوئی گیا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے والا نہیں آج خطرہ اسی بات کا ہے جو اٹھتا ہے جگہ خالی کر کے چلا جاتا ہے۔ آپ سے کیا کہوں، یہ کہنے کی بات نہیں، ہندوستان میں ہم کیا خلا محسوس کر رہے ہیں، کسی مدرسہ میں شیخ الحدیث کی ضرورت ہے، شیخ الحدیث نہیں مل رہا ہے، کہیں اصول فقہ پڑھانے والا نہیں مل رہا ہے، کچھ اللہ کے بندے یہاں آگئے اور کچھ اللہ مہیاں کے یہاں چلے گئے، ایک نے انتقال کیا تو دوسرا منتقل ہو گیا، ہمارے حق میں نتیجہ ایک ہوا، مطلب یہ ہے کہ خلا پڑ ہونا چاہیے اور اس کے لیے جانفشانیوں کی ضرورت ہے، یہ کام بغیر جانفشانیوں کے نہیں ہو سکتا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ حدیث کا جید عالم پیدا ہو، فقہ کا کوئی جید عالم پیدا ہو، تو اس کے لیے پتا پانی کرنے کی ضرورت ہے اور افسوس ہے کہ اب ہمارے مدارس میں اس کا رواج نہیں رہا، سب کچھ ہے لیکن وہ محنت نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ مبالغہ سہی مگر کسی درجہ میں انہماک ہونا چاہیے، یورپ

میں جو ترقیاں ہوئی ہیں اسی لائن سے ان میں بھی استغراق ہے، میں نے واقعات سنے ہیں کہ بعض تحقیقی کام کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوئی کہ کب صبح ہوئی اور کب شام ہوئی، میرے جاننے والے ایک دوست جرمی گئے تھے انھوں نے کہا ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کب کام شروع کرتے ہیں، آپ کا یہ ادارہ کب سے کھلتا ہے، تو اس نے کہا ابھی بتاتا ہوں، وہ اندر گیا اور ایک آدمی سے پوچھا کہ میرا شعبہ کب سے کھلتا ہے، اس نے بتایا، اتنے بجے تو آ کر کہہ دیا کہ اتنے بجے سے، میں نے کہا کیوں آپ نے خود کیوں نہیں بتلایا تو اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں میں اتنی صبح آ جاتا ہوں کہ مجھے ہوش نہیں رہتا اور میں گھڑی بھی نہیں دیکھتا، کام کا جوش اتنا غالب ہوتا ہے۔

میرے عزیز طلبہ! یہ انتشار کا دور ہے، آج کل تو بڑی مصیبت یہ ہے کہ آپ یہاں سے جاییں، پچاس چیزیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جو انتشار پیدا کرنے والی ہوں گی۔ آپ ایسے حالات دیکھیں گے جو انتشار پیدا کرنے والے ہوں گے آپ ایسی تصویریں دیکھیں گے جو ساری ذہنی یکسوئی ختم کر دیں گی اور اگر ٹیلی ویژن ہو رہا ہے تو سبحان اللہ یا اللہ کہہ دیجیے، اس زمانہ کی خوبی یہ تھی کہ انتشار پیدا کرنے والی چیزیں کم تھیں اور لوگوں میں علمی استغراق تھا، میرے ایک مغربی استاد نے بتایا کہ ایک صاحب مغرب (مراکش) میں فقہ مالکی پر کتاب لکھ رہے تھے، ان کا روزانہ کا یہ معلوم تھا کہ دوپہر کو وہ گھر جاتے تھے اور کھانا کھاتے تھے اور آ جاتے تھے، ایک دن وہ گھر نہیں گئے تو لوگوں نے کہا کہ آج آپ کھانے پر تشریف نہیں لائے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، میں تو آیا تھا! میں نے کھانا بھی کھایا، اب ان کو فکر ہوئی کہ کیا بات ہوئی، معلوم ہوا کہ مسئلہ سوچتے ہوئے نکلے اور ایک گھر کا دروازہ کھلا تھا اس میں چلے گئے اور وہ لوگ اتنے مشفق اور مہذب تھے کہ انھوں نے کھانا کھلایا اور ان کو بالکل محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کا گھر نہیں ہے، اس زمانہ میں علماء کی قدر تھی، ان کو شاید یہ معلوم تھا کہ وہ اس وقت نکلتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں، گھر والوں نے دسترخوان بچھایا، ہاتھ دھلائے، انھوں نے کھانا کھایا، ہاتھ پونچھے اور اپنی جگہ آ گئے اور یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے گھر گئے تھے اور کھانا کھایا تھا۔

ایک واقعہ امام غزالیؒ نے غالباً احوال العلوم میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ کے گھر آئے۔ امام صاحب کے بچے کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے تھے کہ ہمارے والد ہر نماز کے بعد امام شافعی کے لیے دعا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ:

”اے اللہ! محمد بن ادریس کو زندہ رکھ، قائم رکھ، ان کی عمر میں برکت دے۔“

وہ بچے سوچتے تھے کہ ہمارے باپ امام وقت ہیں ان کے استاد کیسے ہوں گے جن کے لیے یہ دعا کر رہے ہیں؟

تو ایک مرتبہ پوچھا کہ اباجان! آپ کس کے لیے دعا کرتے ہیں اور کیوں؟ انھوں نے کہا:

”یا بنی انه كالشمس للدنیا والعافیة للبدن۔“

ایک مرتبہ لطیفہ پیش آیا کہ امام شافعی تشریف لے آئے تو گھر والوں نے سمجھا کہ گھر بیٹھے دولت ملی، بڑی خاطر مدارت کی اور رات کو جب وہ کھانا کھا کے اور باتیں کر کے بستر پر لیٹے تو بچوں نے سوچا کہ والد صاحب اور بڑا وقت عبارت میں گزارتے ہیں، یہ تو ہمارے والد کے بھی استاد ہیں، ان کی تو پلک بھی نہیں لگے گی، رات بھر عبادت کریں گے، چنانچہ انھوں نے لوٹا بھر کر رکھ دیا کہ رات کو انھیں گے، وضو کریں گے، عبادت میں مشغول ہو جائیں گے لیکن وہ صبح تک سوتے رہے، یہاں تک کہ امام احمد بن حنبلؒ آئے اور انھوں نے اٹھایا، وہ اٹھے اور بے وضو کیے ہی نماز پڑھنے چلے گئے، اب تو ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ یا اللہ قصہ کیا ہے؟ لوٹا دیکھا تو ویسا کا ویسا بھرا کھا ہے، بڑی حیرت کہ انھوں نے بے وضو نماز پڑھی، اس زمانہ میں اعتراض کرنے کا رواج نہیں تھا، جب وہ مجلس میں آ کر بیٹھے تو امام احمد بن حنبلؒ سے امام شافعی نے کہا کہ ابو عبد اللہ رات کو عجیب واقعہ پیش آیا جب تم مجھے لٹا کر گئے تو فلاں حدیث کی طرف میرا ذہن چلا گیا، میں نے اس سے مسائل استنباط کرنے شروع کیے، رات بھر مسائل استنباط کرتا رہا، مسائل کی ایک بڑی تعداد بیان کر کے فرمایا کہ اتنے مسائل استنباط کر چکا تھا کہ صبح ہو گئی، اسی لیے شاعر نے کہا ہے:

کار پا کاں را قیاس از خود مکیر
گرچہ باشد درنو شستن شیر، شیر

اگر بدگمانی کا دور ہو تا تو اخبار میں چھاپ دیا جاتا کہ ایسے ایسے علماء ہیں جو بے وضو نماز پڑھ لیتے ہیں، بلکہ پڑھا بھی دیتے ہیں تعجب نہیں کہ انھوں نے نماز پڑھائی بھی ہو، بھلا ان کی موجودگی میں کون نماز پڑھاتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس خلا کو پُر فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

شیاطین سے بچنے کے لیے

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ (زندگی کے راستے میں) ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اس میں شیاطین بھی آتے ہیں جو ایک ایک کو پکارتے ہیں کہ اے اللہ کے بندو! ہماری طرف آؤ اصل راستہ تو ہمارا ہی ہے۔ یہ سب کوششیں وہ اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے کرتے ہیں، تو (تم ان کے شر سے بچنے کے لیے) اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور اللہ کی رسی قرآن میں ہے۔ (درمنثور)